مطالعہ قرآن حکیم

منتخب نصاب (درس ۲۶)

ڈاکٹر اسرار احمد

اُمتِ مسلمہ سے خطاب کے ضمن میں
قرآنِ حکیم کی جامع ترین سورت
اُمُّ المُسَبِّحات : سورۃ الحدید
(۱۱)

نحمدہٗ ونصلی علٰی رسولہ الکریم ...... اما بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ۔ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿ اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۞ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۞ اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ۞ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ڰ وَالشُّهَدَاۗءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۞ ﴾ (آیات ۱۶ تا ۱۹)

سورۃ الحدید کا چوتھا حصہ ہمارے زیرِ مطالعہ ہے' جو چار آیات (۱۶ تا ۱۹) پر مشتمل ہے۔ اس کی پہلی تین آیات (۱۶ تا ۱۸) پر ہماری گفتگو ماقبل درس میں تقریباً مکمل ہو چکی ہے۔ اس حصہ کی چوتھی اور آخری آیت (آیت ۱۹) اس سورۂ مبارکہ کی عظیم ترین آیات میں سے ہے۔ بعض اعتبارات سے اس کے جو اصل مفاہیم ہیں اور اس کی جو اصل عظمت ہے' واقعہ یہ ہے کہ اس کی طرف بہت کم توجہ ہوئی ہے۔ اس کے کچھ اسباب ہیں جو بعد میں بیان ہوں گے۔ اس آیۂ مبارکہ پر غور کرنے سے پہلے ان چاروں آیات کی ترجمانی کر لی جائے!

سلوکِ قرآنی۔ منزل بمنزل

ارشاد ہوا: ﴿اَلَمۡ یَاۡنِ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ تَخۡشَعَ قُلُوۡبُهُمۡ لِذِکۡرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الۡحَقِّ ۙ﴾ ''کیا ابھی وقت نہیں آیا ہے اہل ایمان کے لئے (ایمان کے دعوے داروں کے لئے) کہ ان کے دل واقعتاً جھک جائیں اللہ کی یاد کے لئے اور (وہ تسلیم کر لیں اس سب کو) جو حق میں سے نازل ہوا ہے''۔ یہ جھک جانا قبولیت کے لئے ہے اور اس میں تواضع بھی ہے۔ یعنی اہل ایمان اللہ کی یاد میں جھک جائیں اور جو کچھ حق میں سے نازل ہوا ہے' یعنی قرآن حکیم' اس کو قبول کریں جیسے کہ قبول کرنے کا حق ہے' اسے تسلیم کریں جیسے کہ تسلیم کرنے کا حق ہے۔ ﴿وَلَا یَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلُ﴾ ''اور نہ ہو جائیں ان لوگوں کے مانند جنہیں کتاب دی گئی تھی پہلے'' ﴿فَطَالَ عَلَیۡهِمُ الۡاَمَدُ﴾ ''تو اُن پر ایک طویل مدت گزر گئی'' ﴿فَقَسَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ ؕ﴾ ''تو اُن کے دل سخت ہو گئے'' ﴿وَکَثِیۡرٌ مِّنۡهُمۡ فٰسِقُوۡنَ ﴿﴾﴾ ''چنانچہ اب ان میں سے بہت سے فاسق و فاجر ہیں''۔

﴿اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ یُحۡیِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا ؕ﴾ ''جان رکھو! کہ اللہ تعالیٰ زمین کو اس کے مُردہ ہونے کے بعد از سرِ نو زندگی عطا فرما دیتا ہے''۔ یعنی اگر تم بھی اپنے دلوں میں جھانکو اور محسوس کرو کہ دل میں سختی ہے' دل میں ایمان کا نور نہیں ہے' ایمان کی فصل نہیں لہلہا رہی ہے تو مایوس نہ ہو۔ ﴿قَدۡ بَیَّنَّا لَکُمُ الۡاٰیٰتِ لَعَلَّکُمۡ

تَعْقِلُوْنَ ﴿﴾ ''ہم نے تو تمہارے لئے اپنی آیات کو واضح کر دیا ہے (تمہاری سبق آموزی کے لئے ہم نے اپنی آیات کو نمایاں کر دیا ہے) تاکہ تم عقل سے کام لو (غور کرو' سمجھو)''۔ لیکن اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے دلوں کی کشتِ ویراں میں بھی ایمان کی بہار دوبارہ آئے تو کچھ محنت اور مشقت کرنی ہوگی' ہل چلانا ہوگا۔ وہ ہل کیا ہے؟

﴿اِنَّ الْمُصَّدِّقِیْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ ﴾ ''یقیناً کثرت کے ساتھ صدقہ وخیرات کرنے والے مَرد اور کثرت کے ساتھ صدقہ و خیرات کرنے والی عورتیں''۔ یہ ''مُصَّدِّقِیْنَ'' دراصل ''مُتَصَدِّقِیْنَ'' ہے۔ بابِ تفعّل میں ''ت'' ''ص'' کے ساتھ مدغم ہو جانے کی وجہ سے مُتَصَدِّقِیْنَ کی بجائے مُصَّدِّقِیْنَ اور مُتَصَدِّقٰتِ کی بجائے مُصَّدِّقٰتِ ہو گیا ہے۔ ﴿وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ﴾ ''اور جنہوں نے قرض دیا ہو اللہ کو قرضِ حسنہ''۔ جنہوں نے نہایت عمدگی' حسن نیت اور خوبصورتی کے ساتھ اللہ کو قرض دیا ہو اور اس میں مال بھی وہ صرف کیا ہو جو محبوب ہو۔ ﴿ یُّضٰعَفُ لَهُمْ ﴾ ''ان کے لئے (جو کچھ انہوں نے دیا ہوگا) اسے بڑھایا جاتا رہے گا''۔ ﴿ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِیْمٌ ﴿﴾ ''اور (اس پر مستزاد) ان کے لئے بہت ہی باعزت اجر ہوگا''۔

﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ﴾ ''اور جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر وہی ہیں صدیق اور شہید اپنے ربّ کے پاس''۔ ﴿ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ؕ﴾ ''ان کے لئے محفوظ ہے ان کا اجر بھی اور ان کا نور بھی''۔ ﴿وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ ﴿﴾ ''اور جنہوں نے کفر کیا اور تکذیب کی ہماری آیات کی تو وہ جہنم والے ہیں۔''

جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے' تربیت اور تعلیم کا یہ ایک مسلّمہ اصول ہے کہ ایک طرف زجر و ملامت' سختی' تنبیہہ اور تہدید ہو' لیکن ساتھ ہی حوصلہ افزائی بھی ہو' تھپکی بھی دی جائے' شاباش بھی ہو۔ دل کی اُن ہمتوں کو ازسرنو سہارا دیا جائے جو کمزور پڑ رہی ہوں۔ ان چار آیات کے لئے میں نے ''سلوکِ قرآنی'' کا عنوان تجویز کیا ہے۔ پہلی آیت میں جھنجھوڑنے کا انداز ہے کہ کیا ہو گیا ہے؟ کیوں تاخیر و تعویق میں

پڑے ہوئے ہو؟ ایمان کا دعویٰ بھی کرتے ہو لیکن اس کے حقوق ادا کرنے کو تیار نہیں ہو! ﴿لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴾ ''کیوں کہتے ہو وہ جو کرتے نہیں ہو؟'' اور اس کے ساتھ ہی تہدید اور تنبیہ بھی ہے کہ دیکھ لو! تم سے پہلے بھی ایک اُمت تھی' اور بعض اعتبارات سے تو اس کی بڑی فضیلت تھی' ان کے ہاں بیسیوں نبی مبعوث ہوئے۔ ظاہر بات ہے کہ چودہ سو برس تک اُن میں نبوت کا تار ٹوٹا ہی نہیں' تو یقیناً بیسیوں نبی آئے ہوں گے۔ بہرحال انہیں بھی کتابیں دی گئی تھیں۔ ایک کتاب کا یہاں جو خاص طور پر ذکر ہو رہا ہے وہ تورات ہے۔ فرمایا: ﴿وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ﴾ ''اور ان لوگوں کے مانند نہ ہو جائیں جنہیں کتاب دی گئی تھی پہلے''۔ اگر ''الکتاب'' میں ''ال'' کو لامِ جنس مانا جائے تو یہاں پر تین کتابیں مراد ہو سکتی ہیں' تورات' انجیل اور زبور۔ تو یہاں متنبہ کیا جا رہا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ تم بھی اسی انجام سے دوچار ہو جاؤ جس انجام سے وہ دوچار ہو چکے ہیں اور وہ نشانِ عبرت بن چکے ہیں۔

اگلی آیت میں حوصلہ افزائی ہے کہ گھبراؤ نہیں' مایوس نہ ہو جانا۔ جیسے ایک جگہ فرمایا گیا ہے: ﴿لَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ﴾ (یوسف:۸۷) ''اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہونا'' بلکہ اللہ تعالیٰ کی یہ قدرت ہے کہ وہ تمہاری نگاہوں کے سامنے مُردہ زمین کو زندہ کر دیتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کی اس مُردہ کھیتی کو ایمان' عمل صالح اور انفاق فی سبیل اللہ کی فصل سے آباد کر دے گا۔ البتہ اس کے لئے تمہیں ہل چلانا ہو گا' دل سے حبِّ مال کی نجاست کو نکالنا ہو گا۔ حبِّ دُنیا کے لئے علامت (Symbol) مال کی محبت ہے۔ اسے ہر دو طریقوں پر دل سے نکالنا ہو گا' محتاجوں کی فلاح و بہبود پر خرچ کر کے بھی اور اللہ کے دین کے قیام کی جدوجہد کے لئے بھی۔ مَیں اس سے قبل عرض کر چکا ہوں کہ یہ حبِّ مال ایک طرح کا بریک ہے۔ یہ بریک کھلے گا تو گاڑی چلے گی' ورنہ ایکسیلیٹر دباتے رہو گے گاڑی حرکت نہیں کرے گی۔ اس کے لئے دونوں مدّیں بیان کر دی گئیں۔ ایک مدّ صدقہ اور خیرات ہے کہ غرباء' مساکین' یتیموں کی فلاح و بہبود کے لئے خرچ کرنا' بھوکوں کو کھانا کھلانا' جو بیمار ہیں اُن کے علاج

معالجے کی صورت پیدا کرنا' مقروضوں کا قرض ادا کرنا۔ اور دوسری مدّ ہے اللہ کے دین کے لئے قرضِ حسنہ دینا' اللہ کے دین کے غلبے کے لئے' اس کی حکومت قائم کرنے کے لئے بڑھ چڑھ کر مال صرف کرنا۔ اس سے دل کی نجاست دُور ہو جائے گی۔ اسی کا نام ''تزکیہ'' ہے۔ ''زکوٰۃ'' کا لفظ اسی مالی عبادت کے لئے اسمِ علم ہے۔ اس لئے کہ اس سے تزکیہ ہوتا ہے' اس سے دلوں کے اندر کی نجاست دھلتی ہے' اور وہی درحقیقت ایمان کے راستے میں رکاوٹ ہے۔

تزکیہ کا مفہوم ایک مثال سے سمجھئے! دیکھئے ایک باغبان نے اپنے باغ میں کچھ پودے اور درخت تو خود لگائے ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ یہ پودے یا درخت پروان چڑھیں۔ لیکن کچھ خودرو گھاس اور جھاڑ جھنکاڑ اِدھر اُدھر اُگ آئی ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ یہ خودرَو نباتات (unwanted plants) ہوا میں سے آکسیجن کو بھی جذب کر رہی ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو پوری کی پوری آکسیجن جو مہیا ہے وہ اس پودے اور درخت کے لئے ہوگی کہ جو باغبان چاہتا ہے کہ پروان چڑھے۔ اسی طرح زمین کے اندر جو بھی قوتِ نمو ہے اس میں سے بھی یہ کھینچ رہے ہیں' ورنہ یہ ساری قوتِ نمو اُس پودے کے لئے ہوگی جو پودا باغبان چاہتا ہے کہ پروان چڑھے۔ لہٰذا باغبان کُھرپہ ہاتھ میں لے کر اِن سب کو صاف کر کے پھینک دیتا ہے' تاکہ اصل پودا یا درخت بڑھے اور پروان چڑھے۔ یہ تزکیہ ہے۔ اسی طرح انسان کی اصل نشوونما کے لئے بھی ضروری ہے کہ مال کی محبت' جو اصل میں علامت ہے دنیا کی محبت کی' اس کی گرفتاری سے اسے نجات ملے۔ یہ بند اور بریک کھلے گا تب ہی اس کی نشوونما کا راستہ آسان ہوگا۔

آیات ۱۸ و ۱۹ کا باہمی ربط

اب ہم اس چوتھی آیت کا تفصیلاً اور بغور مطالعہ کرتے ہیں۔ دراصل دو حجابات کی وجہ سے اس کی اصل عظمت منکشف نہیں ہو پا رہی۔ سورۃ البلد کی آیات مَیں نے آپ کے سامنے پیش کی تھیں' وہاں لفظ ''ثُمَّ'' آ گیا ہے جو کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔ فرمایا: ﴿فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ﴾ ''انسان گھاٹی کو عبور نہ کر پایا''۔ ﴿وَمَا اَدْرٰکَ مَا

الْعَقَبَةُ ﴿۱۲﴾ ''اور تم نہیں جانتے کہ وہ گھاٹی کون سی ہے''۔ ﴿فَكُّ رَقَبَةٍ ﴿۱۳﴾ اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ ﴿۱۴﴾ یَّتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ﴿۱۵﴾ اَوْ مِسْكِیْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ﴿۱۷﴾﴾ ''کسی گردن کو غلامی سے چھڑانا' یا فاقے کے دن کسی قریبی یتیم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا۔ پھر آدمی اُن لوگوں میں شامل ہو جو ایمان لائے اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر اور (خلقِ خدا پر) رحم کی تلقین کی''۔ اب اس لفظ ''ثُمَّ'' نے وہاں پر موجود اصل مفہوم کے خزانوں کو کھول دیا ہے۔ یوں سمجھئے کہ پہلے اگر آپ نے زمین تیار کی ہے' ہل چلایا ہے' پھر بیج ڈالا ہے تو وہ بیج بارآور ہوگا اور فصل اُگے گی۔ لیکن آپ نے اگر زمین پہلے تیار نہیں کی' ہل چلایا ہی نہیں اور جا کر بیج ڈال دیا تو بیج بھی صاف ظاہر ہے ضائع ہو جائے گا۔ اسی طرح آپ نے اگر اپنے نفس کی یا باطنی شخصیت کی زمین میں ہل چلا لیا ہے' مال کی محبت یہاں سے نکال دی ہے تو اب جو ایمان کا بیج پڑے گا تو اس میں پوری فصل لہلہائے گی۔ چنانچہ سورۃ البلد میں فرمایا: ﴿ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ﴿۱۷﴾﴾ ''پھر وہ شامل ہو اُن لوگوں میں جو ایمان لائے اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر اور باہمی مرحمت کی تاکید کی''۔

سورۃ العصر کا مضمون بھی بالکل یہی ہے۔ سورۃ العصر کے الفاظ ہیں : ﴿وَالْعَصْرِ ﴿۱﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ﴿۲﴾ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴿۳﴾﴾ ''قسم ہے زمانے کی' یقیناً تمام انسان خسارے میں ہیں' سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کئے اور ایک دوسرے کو حق بات کی تاکید اور صبر کی تلقین کی''۔ فرق صرف یہ ہے کہ ترتیب بدل گئی ہے۔ سورۃ العصر میں پہلے ایمان ہے' پھر عمل صالح ہے' پھر تواصی بالحق ہے اور پھر تواصی بالصبر ہے۔ جبکہ یہاں دونوں جوڑوں میں ترتیب الٹ گئی ہے۔ عمل صالح پہلے آیا ہے اور ایمان بعد میں۔ پہلے فرمایا: ﴿فَكُّ رَقَبَةٍ ﴿۱۳﴾ اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ ﴿۱۴﴾ یَّتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ﴿۱۵﴾ اَوْ مِسْكِیْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ﴿۱۶﴾﴾ ''کسی گردن کو غلامی سے

چھڑانا' یا فاقے کے دن کسی قرابت دار یتیم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا۔'' یہ عمل صالح ہے۔ آگے فرمایا: ﴿ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ ''پھر وہ شامل ہوا اُن لوگوں میں جو ایمان لائے''۔ یہاں ایمان بعد میں آ رہا ہے۔ اسی طرح تواصی بالحق بعد میں آ رہا ہے اور تواصی بالصبر پہلے آ رہا ہے۔ فرمایا: ﴿وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ﴾ ''اورانہوں نے ایک دوسرے کو صبر اور باہمی مرحمت کی تاکید کی''۔ یہاں ''تَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ'' گویا ''تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ'' کی جگہ ہے۔ لیکن عمل صالح اور ایمان کو جوڑنے والی جو چیز ہے وہ لفظ ''ثُمَّ'' ہے' جس نے کہ حقائق کے خزانے کا دروازہ کھول دیا ہے۔ یہاں (سورۃ الحدید کی آیت ۱۸ اور ۱۹ کے مابین) چونکہ ایسا کوئی لفظ نہیں ہے لہٰذا یہاں تدبر کی ضرورت ہوگی کہ ان دونوں آیتوں میں ربط کیا ہے۔

ان دونوں آیات کا ترجمہ یوں ہے: ''یقیناً صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور جو لوگ اللہ کو قرضِ حسنہ دیں' ان کے لئے ان کا دیا ہوا مال بڑھایا جاتا رہے گا اور ان کو اجر ملے گا بہت ہی باعزت۔ اور وہ لوگ جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر وہ صدیق اور شہید ہیں''۔ ان دونوں آیات کے درمیان بھی گویا لفظ ''ثُمَّ'' محذوف ہے۔ اور یہ آپ کی سمجھ میں اُس وقت تک نہیں آ سکتا جب تک یہ دو اصول سامنے نہ ہوں۔ ایک تو یہ کہ قرآن مجید کی آیات کے مابین بڑا گہرا ربط ہے۔ اس کی اہمیت بھی بہت کم لوگوں کے سامنے آئی ہے اور بہت کم لوگوں نے اس پر توجہ کی ہے کہ آیاتِ قرآنی باہم مربوط ہونی چاہئیں۔ اگر آپ نے علیحدہ علیحدہ آیت پر غور کر کے کچھ علم' معرفت' فہم اور ہدایت حاصل کی اور اس پر اکتفا کر لیا تو یقیناً وہ بھی بہت بڑی قیمتی متاع ہے' لیکن آیات کے باہمی ربط سے اس کے حسن معنوی کے کچھ اور پہلو بھی نمایاں اور منکشف ہوتے ہیں' جو یہاں لفظ ''ثُمَّ'' کے نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل رہ گئے ہیں۔

دوسرا اصول یہ سامنے رہنا چاہئے کہ ''اَلْقُرْاٰنُ يُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا'' یعنی قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تفسیر کرتا ہے۔ اس اصول کو سب لوگ تسلیم کرتے ہیں' لیکن

اس کا انطباق اور اس کا حق ادا کرنا' یہ اپنی جگہ پر ایک دوسرا مرحلہ ہے۔ لہٰذا یہاں پر اِن دونوں اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے لفظ ''ثُمَّ'' کو محذوف سمجھئے۔ یعنی وہ لوگ جو صدقات کے ذریعے اور اللہ کو قرضِ حسنہ دے کر اپنے دلوں سے مال کی محبت اور اس کی نجاست کو دھو ڈالتے ہیں' پھر وہ جب ایمان لاتے ہیں تو اب ان کے لئے مقامِ صدیقیت اور مرتبۂ شہادت تک پہنچنے کا راستہ کھلا ہوا ہے۔ اب گویا وہ بریک کھل گئی' اب آگے بڑھنے کے لئے راستے کھلے ہیں۔ آگے بڑھنے کے اعتبار سے یہاں صدیقیت اور شہادت کے مراتب کا تذکرہ ہوا ہے۔ بدقسمتی سے ان اصطلاحات پر بھی توجہ بہت کم ہوئی ہے۔ میں آج آپ کے سامنے ان چیزوں کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کروں گا۔

قرآنی اصطلاح کے طور پر ''شہید'' کا مفہوم

اب دوسرے حجاب کو سمجھئے۔ لفظ ''شہید'' کے عام طور پر دو مفہوم ہیں۔ ان میں سے قرآن مجید کے اعتبار سے جو مفہوم زیادہ اہم ہے وہ کچھ اور ہے' وہ مَیں آگے چل کر بیان کروں گا۔ لیکن بدقسمتی سے دوسرا مفہوم جو اِس لفظ کا شاذ مفہوم ہے اور قرآن میں تقریباً ذکر ہی نہیں ہوا' وہ عام اور رائج ہو گیا ہے۔ وہ مفہوم اس آیت کے اصل فہم میں پردہ اور حجاب بن گیا ہے۔ عام طور پر ہمارے ہاں شہید کے معنی ''اللہ کی راہ میں قتل ہونے والا'' لئے جاتے ہیں۔ پورے قرآن مجید میں یہ لفظ اس معنی میں کہیں نہیں آیا سوائے سورۂ آل عمران کی ایک آیت کے' جہاں صرف امکان ہے کہ وہ معنی لئے جا سکیں۔ ورنہ اللہ کی راہ میں قتل ہونے والے کے لئے بھی لفظ مقتول فی سبیل اللہ آیا ہے۔ جیسے فرمایا گیا ہے: ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ ط﴾ (البقرۃ:۱۵۴) ''اور ان لوگوں کو جو اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں مُردہ مت کہو!'' اور ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا ط﴾ (آل عمران:۱۶۹) ''اور ان لوگوں کو جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں' مُردہ مت گمان کرو!'' قرآن میں نبیوں اور رسولوں کے لئے بھی قتل کے الفاظ ذکر ہوئے ہیں۔ جیسے: ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ج

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰی اَعْقَابِكُمْ ۭ﴾ (آل عمران:۱۴۴) ''اور محمد (ﷺ) نہیں ہیں مگر ایک رسول' ان سے پہلے بھی کئی رسول گزرے ہیں' تو کیا اگر اُن پر موت آ جائے یا وہ قتل کر دیئے جائیں (اللہ کی راہ میں) تو تم لوٹ جاؤ گے اپنی ایڑیوں کے بل؟''

قرآن مجید کے کسی مقام پر بھی یہ لازم نہیں آتا کہ مقتول فی سبیل اللہ کے لئے لفظ ''شہید'' ہی ترجمہ کیا جائے۔ سورۂ آل عمران کی ایک آیت میں صرف امکان ہے کہ مقتول فی سبیل اللہ کے لئے لفظ ''شہید'' ترجمہ کیا جائے۔ اس آیت میں الفاظ وارد ہوئے ہیں: ﴿وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ۭ﴾ (آیت ۱۴۰) ''اللہ چاہتا ہے (ان آزمائشوں کے ذریعے) کہ تم میں سے کچھ کو اپنا گواہ بنا لے'' یا ''تم میں سے کچھ کو اللہ اپنی راہ میں قتل ہونے کا مرتبہ عطا کر دے''۔ ذہنوں میں اس لفظ ''شہید'' کا مفہوم یہ بیٹھ گیا ہے کہ ''اللہ کی راہ میں قتل ہونے والا''۔ اگرچہ حدیث میں یہ لفظ مقتول فی سبیل اللہ کے لئے آیا ہے لیکن وہ باب اِستفعال سے ''اُسْتُشْهِدَ'' کی صورت میں ہے کہ اس کی شہادت قبول کر لی گئی' اس کو شہادت کا مرتبہ دے دیا گیا۔ لیکن عام طور پر ہماری زبانوں پر یہ لفظِ شہید اُس شخص کے لئے استعمال ہوتا ہے جو اللہ کی راہ میں قتل ہو گیا ہو۔

اس غلط فہمی کے نتیجے میں اس آیت کی قراءت کا بھی فرق پڑ گیا ہے۔ چنانچہ اب اس آیت ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ﴾ کے ظاہری مفہوم سے پہلا سوال تو یہ پیدا ہو گیا ہے کہ کیا سب کے سب مؤمن صدیق ہیں جو ایمان لائے ہیں اللہ اور اس کے رسولوں پر؟ اگر آپ اس آیت کو پچھلی آیت سے کاٹ کر یہاں استیناف سمجھیں گے اور پچھلی آیت سے اس کا ربط پیش نظر نہیں ہو گا تو اس کا مطلب تو یہی ہو گا کہ جو لوگ بھی ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر وہ صدیق ہیں! پھر چونکہ شہید صدیق سے الگ ایک علیحدہ مفہوم کا لفظ سمجھا جا رہا ہے یعنی ''اللہ کی راہ میں قتل ہونے والا'' تو اس بنا پر اکثر حضرات نے ''هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ'' پر وقف کر کے ﴿وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ﴾ کو ایک علیحدہ جملہ مانا ہے۔ یہی وجہ

ہے کہ ہمارے یہاں قرآن مجید میں ''اَلصِّدِّیْقُوْنَ'' اور ''وَالشُّھَدَآءُ'' کے مابین وقف کی علامت لگی ہوتی ہے۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اسلاف میں سے حضرت مجاہدؒ جو تابعی ہیں اور علم قرآن اور علم تفسیر کی بڑی بڑی شخصیتوں اور بزرگوں میں سے ہیں' ان کی رائے یہ ہے کہ یہاں پر ﴿اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ وَالشُّھَدَآءُ عِنْدَ رَبِّھِمْ﴾ کلامِ مسلسل ہے' لہٰذا اسے بغیر وقف کئے رواں پڑھا جائے گا۔

اب آپ سمجھئے کہ اس لفظ ''شہید'' کا اصل مفہوم کیا ہے؟ دیکھئے ''صِدِّیق'' اور ''شَھِید'' قرآن کریم کی دو اہم اصطلاحات ہیں۔ اصطلاحات میں صرف لغوی معانی معتبر نہیں ہوا کرتے' بلکہ لغوی مفہوم کی بنیاد پر اصطلاحی مفہوم کو سمجھنا ہوتا ہے۔ جیسے ''اَمن'' سے ''اِیمان'' بنا ہے' اب ''اِیمان'' نے جب اصطلاح کی شکل اختیار کی تو اس کے معنی ہیں: اَلتَّصْدِیْقُ بِمَا جَآءَ بِہِ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ اسی طرح صِدِّیق' فِعِّیل کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے۔ لہٰذا صِدِّیق سے مراد ہے انتہائی راست گو' راست باز' راست رو انسان' کہ جو ہر اچھی بات کی تصدیق کے لئے ہر وقت آمادہ رہے۔ اور اصطلاحاً اس سے مراد وہ سلیم الفطرت لوگ ہیں کہ جن کے لئے نبی کی دعوت ہرگز اجنبی نہیں ہوتی۔ جیسے ہی نبی کی دعوت اُن کے کانوں تک پہنچتی ہے انہیں ایسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ ان کے دل کی آواز ہے۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
مَیں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے!

اُن کی فطرت اپنی سلامتی پر برقرار ہوتی ہے۔ وہ غور وفکر اور سوچ بچار کرنے والے لوگ ہوتے ہیں' انہیں خود اپنے اندر سے وہ گواہی ابھرتی ہوئی نظر آ رہی ہوتی ہے' لہٰذا جیسے ہی نبی کی دعوت اُن تک پہنچتی ہے فوراً تصدیق کر دیتے ہیں۔ اس کی سب سے نمایاں مثال حضرت صدیق اکبر ؓ ہیں' جن کے بارے میں خود حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں نے جس کے سامنے بھی اپنی دعوت رکھی ہے اس نے کچھ نہ کچھ تامل ضرور کیا ہے سوائے ابوبکر (ؓ) کے۔ انہوں نے ایک لحظہ کی تاخیر کے بغیر تصدیق کی ہے تو

یقیناً یہ صرف اس لئے ہوا ہے کہ یہ چیز پہلے سے ان کی فطرت میں موجود تھی' ورنہ تو یہ بہت بڑا دعویٰ تھا' نبوت ورسالت کا دعویٰ کوئی معمولی دعویٰ تو نہیں ہے۔

اسی طرح اب لفظ ''شہید'' پر غور کیجئے! ''شہید'' کے لغوی معنی ہیں ''جو موجود ہو''۔ شَهِدَ' يَشْهَدُ کا مطلب ہے موجود ہونا۔ شاہد وغائب کے الفاظ ہماری عام بول چال میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ شاہد اسے کہتے ہیں جو موجود ہو اور غائب وہ جو موجود نہ ہو۔ اب اسی لغوی معنی سے اس میں دو اضافی مفہوم پیدا ہوئے۔ غور کیجئے کہ جو شخص کسی وقوعہ کے وقت موجود ہو تو اُسی کی گواہی معتبر ہوتی ہے' لہٰذا جو موجود ہے وہ گواہ ہے۔ اگر کہیں کوئی حادثہ ہوا ہے' کسی کا قتل ہو گیا ہے' یا کوئی اور جرم ہوا ہے' تو جو اُس وقوعہ کے وقت موجود ہو گا وہی تو گواہی دینے کا اہل ہے۔ لہٰذا گواہی موجودگی کی بنا پر ہوتی ہے۔ اور اسی لغوی معنی کی بنیاد پر اِس کے معنی مددگار کے بھی ہیں۔ اس لئے کہ جو کسی ضرورت کے وقت موجود ہو گا وہی مدد کر سکے گا۔ فرض کیجئے آپ کا کوئی بہت ہی جگری' وفادار اور مخلص دوست ہے' لیکن جب وہ وقوعہ پر موجود ہی نہیں ہے تو وہ آپ کی مدد کیسے کر سکے گا؟ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۳ میں یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے:

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾

''اگر تمہیں کوئی شک ہے اُس چیز کے بارے میں جو ہم نے اپنے بندے (محمد ﷺ) پر نازل کی ہے تو پھر تم بھی اس جیسی کوئی ایک سورۃ بنا کر لے آؤ اور اس کے لئے تم اللہ کے مقابلے میں اپنے تمام مددگاروں کو بلا لو (جس کو چاہو جمع کر لو اور اپنی ساری صلاحیت کو بھی مجتمع کر لو اور اُس کا مقابلہ کر لو) اگر تم سچے ہو۔''

یعنی فی الواقع تو تمہیں اِس کے اللہ کا کلام ہونے میں کوئی شک نہیں ہے' لیکن تم صرف بات بنا رہے ہو' تمہارا دل تو گواہی دے رہا ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ تو وہاں ''اَلشُّهَدَآء'' کے معنی مددگار کے ہیں۔ بہر حال یہاں پر اصطلاحاً شہید سے مراد وہ

شخص ہے جو اللہ کی طرف سے اپنی دعوت وتبلیغ کے ذریعے سے لوگوں پر دنیا میں گواہی قائم کرے' حجت قائم کرے اور پھر یہ کہ قیامت کے دن بھی کھڑے ہوکر وہ گواہی دے کہ اے اللہ! میں نے تیرے بندوں تک تیرا یہ پیغام پہنچا دیا تھا' لہٰذا اب یہ خود ذمہ دار ہیں۔ منصبِ رسالت کے لئے قرآن مجید میں یہ لفظ ''شہادت'' انتہائی کثرت کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ رسول دنیا میں حق کی گواہی دیتا تھا۔ (مَیں نے یہاں ماضی کا صیغہ اس لئے استعمال کیا ہے کہ اب یہ سلسلۂ نبوت و رسالت بند ہو چکا ہے۔) یہ فریضۂ منصبی بحیثیت مجموعی اُمت کو ادا کرنا ہے' اب یہ اُمت کا فریضہ رسالت ہے۔ اب شخصی رسالت نبوت کے ختم ہونے کے ساتھ ختم ہوچکی ہے۔ نبی دنیا میں اپنے قول و عمل سے حق کی گواہی دیتا تھا' وہ جو کہتا تھا کر کے دکھاتا تھا' تاکہ ثابت ہو جائے کہ جس بات کی طرف بلایا جارہا ہے وہ ناقابل عمل نہیں ہے' یہ دعوت صرف لفاظی نہیں ہے' بلکہ قابل عمل ہے۔ اور پھر یہ کہ حضور اکرم ﷺ نے تو اِس نظامِ حیات کو قائم کر کے دکھا دیا کہ یہ نظام قائم ہوسکتا ہے اور قائم کیا جا سکتا ہے۔ اور پھر حضور ﷺ نے یہ نظام چلا کر بھی دکھا دیا' تاکہ حجت اپنے آخری درجے کو پہنچ جائے۔ اسی کا نام اتمامِ حجت ہے۔ چنانچہ قیامت کے دن رسول استغاثہ کے چشم دید گواہ (Prosecution witness) کی حیثیت سے کھڑے ہوں گے اور گواہی دیں گے۔[1] ارشادِ الٰہی ہے:

﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا﴾ (النساء: ٤١)

''پس اُس (قیامت کے) دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے اور آپؐ کو بھی (اے محمد ﷺ) اِن لوگوں کے خلاف بطورِ گواہ کھڑا کریں گے!''

اس آیت سے متعلق ایک واقعہ بھی ہے جو ہمارے لئے بہت ہی عبرت انگیز اور سبق آموز ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے

(۱) مَیں نے اس موضوع پر بڑی مفصل تقاریر کی ہیں۔ ''قرآن کا فلسفۂ شہادت'' کے عنوان سے اس کے کیسٹس موجود ہیں۔

فرمائش کی کہ مجھے قرآن سناؤ۔ انہوں نے عرض کیا حضور! آپ کو قرآن سناؤں؟ آپ پر تو یہ نازل ہوا ہے۔ فرمایا: ''ہاں یہ ٹھیک ہے' لیکن مجھے دوسروں سے سن کر کچھ اور لذت حاصل ہوتی ہے''۔ اب انہوں نے امتثالاً للامر (حکم کی بجا آوری میں) سورۃ النساء کی پہلی آیت سے تلاوت شروع کی اور پڑھتے گئے۔ جب آیت ۴۱ پر پہنچے: ﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا﴾ تو حضور ﷺ نے فرمایا: ''اب بس کرو!'' جب حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ (یہ حدیث متفق علیہ ہے۔)

ہر اُمت کی طرف جو بھی رسول بھیجے گئے تھے (علیہ الصلوٰۃ والسلام) وہ رسول قیامت کے دن سرکاری گواہ کی حیثیت سے کھڑے ہو کر گواہی دیں گے کہ اے اللہ! تیرا جو پیغام مجھ تک آیا تھا' میں نے ان تک پہنچا دیا۔ اب یہ اپنے طرزِ عمل کے خود ذمہ دار ہیں' خود جواب دہ ہیں۔ متذکرہ بالا آیت کا اگلا حصہ ہے: ﴿وَجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا﴾ ''اور (اے نبیؐ!) آپ کو ہم لائیں گے ان کے خلاف گواہ کے طور پر''۔ نوٹ کیجئے ''عَلٰی'' کا صلہ جب بھی آتا ہے وہ مخالفت کے لئے ہوتا ہے۔ جیسا کہ بہت ہی مشہور حدیث ہے: ((اَلْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَّكَ اَوْ عَلَيْكَ)) ''قرآن یا تو تمہارے حق میں حجت ہوگا یا تمہارے خلاف حجت بنے گا''۔ شہادت کسی کے حق میں ہوتی ہے اور کسی کے خلاف ہوتی ہے۔ ہر شخص جو گواہ کی حیثیت سے پیش ہوتا ہے' اس کی گواہی کسی کے حق میں اور کسی کے خلاف جاتی ہے۔ جب یہ گواہی ''لِ'' کے صلے کے ساتھ آتی ہے تو کسی کے حق میں جارہی ہوتی ہے۔ جیسے سورۃ النساء میں ارشاد ہوا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾ (آیت ۱۳۵) ''اے اہل ایمان! کھڑے ہو جاؤ پوری قوت کے ساتھ عدل کو قائم کرنے کے لئے اللہ کے حق میں گواہی دینے کے لئے''۔ لیکن یہ خاص طور پر نوٹ کیجئے کہ اکثر و بیشتر اس کے ساتھ ''علٰی'' کا صلہ لگتا ہے۔ قیامت کے دن جب ہمارے اپنے اعضاء و جوارح ہمارے خلاف گواہی دیں گے تو ہم کہیں گے: ﴿لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا﴾ ''تم نے ہمارے خلاف

گواہی کیوں دے دی؟'' تم ہمارے اپنے اعضاء و جوارح ہو کر ہمارے خلاف گواہی دے رہے ہو؟ ہمارے یہ اعضاء و جوارح جواب میں کہیں گے: ﴿اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِیْ اَنْطَقَ کُلَّ شَیْءٍ﴾ (حٰمٓ السجدۃ :۲۱) ''آج اس اللہ نے ہمیں بھی گویائی عطا کر دی ہے جس نے ہر شے کو نطق و گویائی عطا کی ہے''۔ جہاں بھی رسالت کی گواہی کے لئے یہ لفظ آیا ہے''علٰی'' کے ساتھ آیا ہے۔ سورۃ المزمل میں ارشاد ہوا: ﴿اِنَّا اَرْسَلْنَا اِلَیْکُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَیْکُمْ کَمَا اَرْسَلْنَا اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ﴾'' (دیکھو لوگو!) ہم نے بھیج دیا ہے تمہاری طرف اپنا ایک رسول تمہارے خلاف گواہ کی حیثیت سے' جیسا کہ ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا تھا''۔

رسول دنیا میں تو لوگوں کو حق کی دعوت دیتا ہے' وہ ان کے لئے جو اُس کی دعوت کو قبول کر لیں رحمتِ خداوندی کا مظہر بن جاتا ہے' لیکن جنہوں نے اس کی دعوت کو ردّ کر دیا اُن پر گویا حجت قائم ہو گئی۔ قیامت کے دن اب وہی رسول کھڑا ہو کر اُن لوگوں کے خلاف گواہی دے گا کہ اے اللہ! میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا تھا' میری طرف سے کوتاہی نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر حضور ﷺ نے' جبکہ سوا لاکھ کا مجمع سامنے تھا' یہ سوال کر کے گواہی لے لی: ((اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟)) ''لوگو! میں نے پہنچا دیا کہ نہیں؟'' میری طرف سے حق تبلیغ میں کوئی کمی تو نہیں رہ گئی؟ اور پورے مجمع نے یک زبان ہو کر کہا: ''اِنَّا نَشْهَدُ اَنَّکَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّیْتَ وَنَصَحْتَ'' یعنی ''ہم گواہ ہیں کہ آپ نے حق رسالت ادا کر دیا' حق امانت ادا کر دیا اور ہماری خیر خواہی کا حق ادا کر دیا''۔ بلکہ ایک روایت میں تو یہ تفصیل ہے: ''اِنَّا نَشْهَدُ اَنَّکَ قَدْ بَلَّغْتَ الرِّسَالَةَ وَاَدَّیْتَ الْاَمَانَةَ وَنَصَحْتَ الْاُمَّةَ وَکَشَفْتَ الْغُمَّةَ'' یعنی ''ہاں حضور! ہم گواہ ہیں کہ آپؐ نے رسالت کا حق ادا کر دیا' امانت کا حق ادا کر دیا' اُمت کی خیر خواہی کا حق ادا کر دیا اور گمراہی کے اندھیروں کے پردے چاک کر دیئے''۔ اب حضور ﷺ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور انگشتِ شہادت سے آسمان کی طرف اور پھر لوگوں کی طرف اشارہ کیا: ((اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ' اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ' اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ)) ''اے اللہ تو بھی گواہ رہ!

اے اللہ تو بھی گواہ رہ! اے اللہ تو بھی گواہ رہ!'' انہوں نے تسلیم کر لیا ہے کہ مَیں نے انہیں تیرا پیغام پہنچانے کا حق ادا کر دیا ہے۔ پھر حضور ﷺ نے لوگوں سے فرمایا: ((فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ)) ''اب پہنچائے وہ جو یہاں ہے اُس کو جو یہاں نہیں ہے''۔ یہ ہے اصل میں اُمت کا فریضۂ رسالت۔ اللہ نے بھیجا ہے محمد رسول اللہ ﷺ کو اور محمد ﷺ نے اپنا یہ فریضۂ منصبی اُمت کے حوالے کیا۔ اس لئے کہ حضور ﷺ تو پوری نوعِ انسانی کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾ ''اور ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر تمام انسانوں کے لئے خوش خبری دینے والا اور ڈر سنانے والا بنا کر''۔ اور حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں تو اتمامِ حجت اگر ہوا ہے تو صرف جزیرہ نمائے عرب کے مسلمانوں پر ہوا ہے' قیصر و کسریٰ کو تو آپ ﷺ کے ابھی صرف خطوط ہی گئے تھے' ایران کے لوگوں کو ابھی کیا معلوم تھا کہ وہ دعوت کیا ہے؟ رومیوں کو کیا پتہ تھا کہ وہ دعوت کیا ہے؟ اس کے دلائل کیا ہیں؟ دعوت کے اتمامِ حجت کی حد تک تو فریضہ ادا نہیں ہوا۔ تو یہ کام اب مسلمانوں نے کرنا ہے۔

اب نوٹ کیجئے کہ یہ ہے اصل میں شہادت! اور قرآن مجید میں دو جگہوں پر اسی مفہوم کو بیان کیا گیا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں یہ مضمون اِن الفاظ میں آیا ہے: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ﴾ (آیت ۱۴۳) ''اور اسی طرح ہم نے تمہیں اُمت وسط بنایا ہے تاکہ تم پوری نوعِ انسانی پر گواہی دو (حجت قائم کرو) اور ہمارے رسول تم پر گواہی قائم کریں (حجت قائم کر دیں)''۔ یہ وہ گواہی ہے جو قیامت کے دن ظاہر ہو جائے گی۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ۞﴾ ''پس کیا حال ہوگا (اُس دن) جب ہم ہر اُمت میں ایک گواہ کھڑا کریں گے اور آپ کو (اے نبیؐ!) کھڑا کریں گے ان کے خلاف بطورِ گواہ''۔ اس کے بعد اگلی آیت میں فرمایا: ﴿يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ۞﴾ ''اُس دن جن

لوگوں نے (اس دنیا میں) کفر وانکار کیا تھا' اور رسول (ﷺ) کی نافرمانی کی تھی' تمنا کریں گے کہ کاش وہ زمین میں دھنسا دیئے جائیں! (اُن کے اوپر زمین برابر ہو جائے' نیست و نابود ہو جائیں' ان کا وجود ہی باقی نہ رہے) لیکن وہ وہاں کوئی بات اللہ سے چھپا نہیں سکیں گے''۔

شہادت علی الناس کا یہی مضمون سورۃ الحج کے اخیر میں آیا ہے۔ فرمایا: ﴿وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ﴾ ''اور جہاد کرو اللہ کے لئے جیسا کہ اس کے لئے جہاد کا حق ہے''۔ اور یہ جہاد کس لئے ہوگا؟ ﴿هُوَ اجْتَبٰكُمْ﴾ ''اس نے تمہیں چن لیا ہے''۔ اپنے نصیب پر فخر کرو کہ یہ اُمت مسلمہ اس سلسلۂ رسالت میں ایک کڑی (link) کی حیثیت سے تا قیامِ قیامت جوڑ دی گئی ہے۔ سورۃ الحج کے آخری رکوع میں پہلے یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿اَللّٰهُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ﴾ ''اللہ چن لیتا ہے فرشتوں میں سے بھی اپنے پیغام بر اور انسانوں میں سے بھی''۔ اور اب اس کے بعد فرمایا ہے: ﴿هُوَ اجْتَبٰكُمْ﴾ اس نے تمہیں چن لیا ہے' تمہیں پسند کر لیا ہے۔ اس فریضۂ شہادت علی الناس کی ادائیگی کے لئے تمہارا انتخاب کیا ہے۔ اب آخری رسول تو ہمارے محمد ﷺ ہیں اور باقی نوعِ انسانی پر تا قیامِ قیامت یہ شہادت کی ذمہ داری ادا کرنا تمہارے ذمہ ہے۔ اور ذرا آگے چل کر فرمایا کہ یہ محنت اس لئے کرنی ہے کہ: ﴿لِیَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِیْدًا عَلَیْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ﴾ ''تاکہ رسول تم پر گواہ ہو جائیں اور تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ''۔ یہ ہے قرآن میں شہادت کا اصل مفہوم۔ یہی وجہ ہے کہ تمام رسولوں کو ''شہید'' کہا گیا' حالانکہ رسول تو قتل ہوئے ہی نہیں۔ انبیاء ضرور قتل ہوئے ہیں' لیکن کوئی رسول قتل نہیں ہوا۔ حضرت مسیح علیہ السلام رسول تھے' یہودیوں نے انہیں قتل کرنے کی کوشش کی تو اللہ نے انہیں زندہ آسمان پر اٹھا لیا۔ ﴿وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ﴾ ''انہوں نے نہ تو اسے قتل کیا اور نہ سولی دی''۔ بہرحال یہاں پر (سورۃ الحدید میں) شہید کا مفہوم عام لوگوں نے چونکہ ''مقتول فی سبیل اللہ'' لیا ہے تو اس کی وجہ سے وہ الجھنیں پیدا ہو گئیں جن کی بناء پر اس آیت کی اصل عظمت لوگوں پر منکشف نہیں ہوئی۔

صدیقیت اور شہادت کی حقیقت

اب آپ ان دونوں اصطلاحات ''صدیقیت'' اور ''شہادت'' کی اصل حقیقت کو سمجھئے! دیکھئے' سورۃ الفاتحہ کی پانچویں آیت کے الفاظ ہیں: ﴿اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۞﴾ اور چھٹی آیت میں الفاظ آتے ہیں: ﴿صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ﴾ ''راستہ اُن کا جن پر تیرا انعام ہوا''۔ لیکن وہ کون لوگ ہیں جن پر اللہ کا انعام ہوا' اس کی وہاں پر کوئی وضاحت نہیں ہے۔ اس کی وضاحت سورۃ النساء کی آیت ۶۹ میں بایں الفاظ کر دی گئی: ﴿وَمَنۡ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوۡلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ﴾ ''جو کوئی بھی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا حق ادا کردے گا تو یہ وہ لوگ ہوں گے جو اُن کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا''۔ اور وہ کون لوگ ہیں؟ ﴿مِنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيۡقِيۡنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيۡنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيۡقًا ۞﴾ ''یعنی انبیاء' صدیقین' شہداء اور صالحین۔ اور کیا ہی خوب ہے ان کی رفاقت''۔ تو یہ منعم علیہم چار گروہ ہیں: انبیاء' صدیقین' شہداء اور صالحین۔ ان میں نبوت سرفہرست ہے۔ ''صالحیت'' گویا ان چار مراتب کی base line ہے۔ اس کے اوپر شہداء' ان کے اوپر صدیقین اور سب سے اوپر انبیاء ہیں۔ ظاہر بات ہے نبوت تو پہلے بھی ہمیشہ وہبی شے تھی' کسبی نہیں تھی' کوئی شخص اپنی محنت ومشقت' ریاضت وعبادت اور کسی سلوک کی منازل طے کرنے سے نبوت حاصل نہیں کرسکتا تھا' یہ خالص وہبی شے تھی' جس کا دروازہ اب ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا۔ تو گویا عام انسانوں کے لئے تین درجے کھلے ہوئے ہیں: صالحین' شہداء اور صدیقین۔

صدیق اور شہید کے مابین فرق کیا ہے' یہ جان لیجئے۔ ذرا نوٹ کیجئے' سورۂ مریم میں حضرت ابراہیم اور حضرت ادریس علیہما السلام کے بارے میں ﴿صِدِّيۡقًا نَّبِيًّا﴾ جبکہ حضرت موسیٰ اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کے بارے میں ﴿رَسُوۡلًا نَّبِيًّا﴾ کے الفاظ آئے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ قرآن کریم کا ایک خاصا مشکل مقام ہے کہ ان کے درمیان فرق کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی شخصیت کے جو سانچے

(personality patterns) بنائے ہیں ان میں دو تقسیمیں بہت نمایاں ہیں۔ جدید سائیکالوجی میں آپ انہیں دروں بیں (introvert) اور بروں بیں (extrovert) کہتے ہیں۔ مقدم الذکر لوگ غور و فکر کرنے والے' سوچ بچار میں منہمک' تنہائی پسند اور سلیم الفطرت ہوتے ہیں' جبکہ مؤخر الذکر لوگ فعّال قسم کے' بھاگ دوڑ کرنے والے ہوتے ہیں۔ یہ باہر کی دنیا میں مگن رہتے ہیں اور انہیں اپنے باطن میں جھانکنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ ان کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ خوب گفتگوئیں ہو رہی ہیں' مجلسوں میں خوب بحث ہو رہی ہے' خوش گپی ہو رہی ہے۔ چنانچہ یہ لوگ حقائق کی طرف زیادہ متوجہ نہیں ہوتے۔ ان دو کے علاوہ بہت شاذ لوگ (ambivert) ہوتے ہیں کہ جن کے اندر دروں بینی اور بروں بینی کی دونوں صلاحیتیں موجود ہوں اور توازن کے ساتھ ہوں۔ بلکہ اکثر و بیشتر یہ دو چیزیں اگر کسی میں جمع ہو بھی جائیں تو پھر اُس کا توازن پر قائم رہنا چونکہ مشکل ہوتا ہے اس لئے ambivert کا لفظ بالعموم اچھے مفہوم میں استعمال نہیں ہوتا۔ آدمی یکسو اور یک رخا ہو گا تو وہ زیادہ مستحکم (stable) رہے گا' جبکہ ambivert کے اندر عدمِ استحکام (instability) کے امکانات زیادہ ہو جاتے ہیں۔

کسی شخصیت میں دونوں چیزیں موجود ہوں اور توازن کے ساتھ برقرار ہوں تو اس کی کامل مثال تو ایک ہی ہے اور وہ محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ باقی آپ کو انبیاء میں بھی دو درجہ بندیاں ملیں گی' جیسا کہ آپ کو صحابہ کرام ؓ میں دو درجہ بندیاں ملتی ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی طبیعت کے اندر شروع ہی سے رقیق القلبی موجود تھی۔ کسی کو دکھ میں دیکھتے تو تڑپ اٹھتے' ہر کسی کی تکلیف کو رفع کرنے کی کوشش کرتے۔ پھر یہ کہ سلیم الفطرت تھے' کیسے ممکن تھا کہ کسی بُت کو سجدہ کریں! اور یہ توحید تو فطرتِ انسانی کے اندر موجود ہے' وہ جو ''اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ؟ قَالُوْا بَلٰی!'' کا عہد کر کے آئے تھے اس کے اثرات اس حیاتِ دُنیوی میں موجود تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر الصدیق ؓ نے کبھی بھی کسی بُت کو سجدہ نہیں کیا' کبھی شرک کا ارتکاب نہیں کیا' کبھی

بدکاری نہیں کی۔ گویا کہ ایک پاک طینت' صاف باطن شخصیت ہیں۔ یعنی اندر سے فطرت بھی پاک اور سلیم' اور کردار و اخلاق بھی بہت عمدہ۔ تو ایسے شخص کے سامنے جب نبی کی دعوت آتی ہے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی تاخیر ہو۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مقامِ صدیقیت میں اُمت میں سب سے بلند مرتبہ ہیں اور صدیق ثانی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی دعوت سے جو لوگ ایمان لائے ان میں سرفہرست حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہیں۔

دوسری طرف حضرت عمر اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما ہیں' جن کا مزاج ابوبکر و عثمان رضی اللہ عنہما سے مختلف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو چھ برس بیت جاتے ہیں اور اِن کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیا کہہ رہے ہیں۔ میں نے دو مثالیں اس لئے دی ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کوئی ایسی قرابت داری نہیں تھی' ہوسکتا ہے کہ کچھ اور بھی عوامل کارفرما ہوں' لیکن حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ہیں' خالہ زاد بھائی ہیں' دودھ شریک بھائی ہیں' ساتھ کے کھیلے ہوئے ہم جولی ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انتہائی محبت کرتے ہیں۔ بتائیے کون سا حجاب ہے؟ کیوں نہیں ایمان لائے چھ برس تک؟ اس لئے کہ اُدھر توجہ ہی نہیں ہے۔ سیر و شکار سے فرصت نہیں ہے' کئی کئی دن تک تیر کمان لے کر صحرا کے اندر شکار میں مصروف ہیں۔ غور و فکر اور سوچ بچار والا مزاج ہی نہیں ہے۔ ادھر توجہ ہی نہیں ہے کہ یہ کائنات کیا ہے' اس کا بنانے والا کون ہے اور اس زندگی کا مقصد کیا ہے؟ صرف عدم توجہی ہے' ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عناد ہونے کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ کوئی منفی عامل سرے سے موجود ہی نہیں ہے سوائے عدم توجہی کے۔ چنانچہ چھ برس بعد ایمان لائے ہیں اور وہ بھی جذباتی طور پر۔ شکار سے واپس آئے تو کنیز (حضرت فوزیہ رضی اللہ عنہا) نے کہا کہ آج تو ابوجہل نے آپ کے بھتیجے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر بڑی زیادتی کی ہے' بہت گستاخی کے ساتھ پیش آیا ہے۔ پس وہ جو دل میں محبت تھی اس نے جوش مارا اور سیدھے ابوجہل کے پاس پہنچے جہاں وہ اپنی پارٹی کو لے کر بیٹھا ہوا تھا' جاتے ہی

کمان اس کے سر پر دے ماری جس سے سر پھٹ گیا۔ اس سے کہنے لگے کہ تمہاری یہ ہمت کہ تم نے میرے بھتیجے کے ساتھ یہ معاملہ کیا! اور پھر اسی وقت کہا کہ اچھا میں اس پر ایمان لاتا ہوں' آؤ مقابلہ کرو! یہ شان ہے حضرت حمزہ ؓ کے ایمان کی۔ تو اس کو ذرا اچھی طرح سمجھئے۔ اِن دو شخصیتوں کا فرق اگر نہیں سمجھیں گے' اور یہ جو اللہ تعالیٰ نے مختلف انسانوں کے مختلف مزاج بنائے ہیں ان کا جب تک فہم و شعور نہ ہوگا یہ آیت سمجھ میں نہیں آئے گی' اور یہ کہ صدیقیت اور شہادت کسے کہتے ہیں' یہ بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ شہید کے معنی صرف مقتول فی سبیل اللہ ہی ذہن میں رہ جائیں گے اور یہ جو قرآن مجید کے اصل حقائق و معارف ہیں ان سے محرومی رہے گی۔

یہی معاملہ حضرت عمر ؓ کا ہے۔ ان کے ہاں تو معاملہ اس سے آگے بڑھ کر عصبیت جاہلی کا تھا کہ محمد (ﷺ) تو ہمارے آبائی دین اور آبائی عقائد کی نفی کر رہے ہیں' یہاں تک کہ بالآخر وہ دشمنی اس انتہا کو پہنچ گئی کہ گھر سے تلوار لے کر یہ فیصلہ کر کے نکلے ہیں کہ آج میں ان کا کام تمام کر دوں گا۔ کفارِ مکہ درحقیقت یہ دیکھ رہے تھے کہ بنو ہاشم محمد (ﷺ) کی پشت پناہی کر رہے ہیں' اب اگر ہم نے محمد (ﷺ) کو کوئی گزند پہنچا دیا تو بنو ہاشم ان کے انتقام کے لئے کھڑے ہو جائیں گے' اس طرح ہمارا آپس کا اتحاد پارہ پارہ ہو جائے گا' عرب کے اندر ہماری حیثیت مجروح ہو جائے گی' بلکہ ہماری قبائلی جنگ شروع ہو جائے گی۔ ان کے لئے رکاوٹ صرف یہی تھی۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ اب تو پانی سر سے گزر رہا ہے' گھر گھر میں لڑائی ہو رہی ہے' بھائی بھائی سے کٹ گیا ہے' بیوی شوہر سے جدا ہو رہی ہے' شوہر بیوی سے کٹ گیا ہے' والدین سے اولاد علیحدہ ہو گئی ہے تو ''تنگ آمد بجنگ آمد'' کے مصداق عمر بن خطاب نے فیصلہ کر لیا کہ اب تو جو ہو سو ہو' میں تو انہیں قتل کر دوں گا۔ چنانچہ سیف بدست نکل کھڑے ہوئے۔ راستے میں حضرت حذیفہؓ بن عتبہ ملے' وہ ایمان لا چکے تھے' لیکن عمر کو معلوم نہیں تھا۔ انہوں نے کہا کہ عمر کیا بات ہے؟ اتنے جوش و جلال کے ساتھ کہاں چلے؟ کہا کہ میں نے تو فیصلہ کر لیا ہے کہ آج یہ جھگڑا ختم کر کے رہوں گا' میں محمد (ﷺ) کو قتل کرنے

جارہا ہوں۔ انہوں نے بڑی حکمت سے یہ کہہ کران کا رخ موڑ دیا کہ تمہارے تو اپنے بہن اور بہنوئی ایمان لا چکے ہیں! اب غصے میں آگ بگولہ ہو کر اپنی حقیقی بہن فاطمہ بنت خطاب اور بہنوئی سعید بن زید (رضی اللہ عنہما) کے ہاں پہنچے اور غصہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ اندر قرآن مجید پڑھ رہے تھے۔ وہاں حضرت خباب بن اَرت رضی اللہ عنہ انہیں قرآن پڑھانے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ سورۂ طٰہٰ کی آیات نازل ہوئی تھیں اور وہ آ کرانہیں سنا رہے تھے۔ عمر کی آواز سن کر انہوں نے حضرت خباب ؓ کو تو چھپا لیا۔ عمر نے گھر میں داخل ہو کر بہنوئی حضرت سعیدؓ کو مارنا شروع کیا۔ بہن درمیان میں آئیں تو اُن کو بھی ایک ایسا تھپڑ لگایا کہ چہرہ لہولہان ہو گیا۔ لیکن بہن کی زبان سے یہ جملہ نکلا: عمر! چاہے تم ہمیں جان سے مار دو' اب ہم اس دین کو چھوڑیں گے نہیں جسے ہم نے اختیار کیا ہے۔ ان کا یہی جملہ تھا جو عمر بن خطاب کے انقلاب کی وجہ بنا ع

دگرگوں کرد تقدیر عمر را!

عمر سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ صنفِ نازک میں یہ ہمت اور یہ حوصلہ کیونکر پیدا ہوا! یوں سمجھئے کہ اندر تو سب کچھ تھا' اوپر خول آیا ہوا تھا۔ بس اس خول کے اندر سوراخ ہو گیا' لیکن کسی دلیل و منطق سے نہیں' غور و فکر سے نہیں' یہ ہوا ہے جذباتی طور پر (emotionally)۔ تو اس اُمت کے دو عظیم ترین شہداء ہیں حضرت حمزہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما۔ اور اِس اُمت کے دو عظیم ترین صدیق ہیں حضرت ابوبکر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما۔ اگلی نشست میں ابھی یہ مضمون آگے چلے گا' اس لئے کہ یہ معارفِ قرآن حکیم کا ایک اہم باب ہے۔ اس پر بدقسمتی سے جتنی توجہ ہونی چاہئے تھی میرے علم کی حد تک اتنی توجہ نہیں ہوئی۔

بارك الله لی ولكم فی القران العظيم ونفعنی واياكم بالايات والذكر الحكيم